POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 October 2024, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 85 واں سال

Date of Publication: 09-10-2024 • Price: 5/- • 15-21 October 2024 • Issue: 39 • Vol:83

۱۵تا۲۱راکتوبر۲۰۲۴ء • شمارہ:۳۹ • جلد:۸۳

صحتِ زباں (۱۹)

رؤف پاریکھ

☆ کیلے کی گیلی جڑ اور آجش بکو

کسی زمانے میں تشہیر کی غرض سے سینماؤں پر فلموں کے بڑے بڑے بینر اور پوسٹر آویزاں کیے جاتے تھے اور جو فلم نمائش پذیر ہوتی تھی اس کے پوسٹر پر انگریزی کی تقلید میں (انگریزی لفظ tonight کے ترجمے کے طور پر) 'آج شب کو' لکھا جاتا تھا۔ لیکن اسے عموماً ملا کر یعنی آجشبکو لکھا جاتا تھا۔ ہمارے اسکول کے راستے میں ایک سینما پڑتا تھا اور ہم اس کا پوسٹر پڑھتے تو اس پر 'آجشبکو' لکھا ہوا دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ ہم اسے 'آجش بکو' پڑھا کرتے تھے۔ 'بکو' تو سمجھ جاتے تھے (کہ اس زمانے میں بھی بکا کرتے تھے) لیکن آجش کا مطلب کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔

پھر کسی ہم جماعت نے کلاس میں مقابلے کی دعوت دی کہ 'کیلے کی گیلی جڑ' قلم کو کاغذ سے اٹھائے بغیر لکھ کر دکھاؤ۔ ہم نے ہار مان لی تو اس نے لکھ کر دکھایا: کیلیکیگیلیجڑ (البتہ نقطے اور کاف اور گاف کی کشش لگانے کے لیے تو قلم اٹھانا ہی پڑا)۔ تب اندازہ ہوا کہ آجشبکو بھی اسی طرح کی کوئی اوٹ پٹانگ حرکت ہے جیسی کیلے کی گیلی جڑ۔

مقصد اس ساری تمہید کا یہ ہے کہ بعض لوگ لفظوں کو غیر ضروری طور پر ملا کر لکھتے ہیں، مثلاً دست کاری اور دست گیر کو ملا کر جب دستکاری اور دستگیر لکھا جاتا ہے تو طالبِ علم اسے دس تکاری اور دس تگیر پڑھتے ہیں۔ ان کا ذکر پچھلی ایک قسط (صحتِ زباں، ۱۷) میں ہو چکا ہے۔ چلیے صاحب یہ تو مرکب ہیں اور بعض مرکبات میں لفظوں کو جوڑ کر لکھنا درست سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اب ایک لفظ کے طور پر برتے جاتے ہیں (اگرچہ توڑ کر لکھنا بہتر ہے کیوں کہ اس سے طالبِ علموں کو پڑھنے میں سہولت ہو جاتی ہے)، مثلاً دلچسپ (دل چسپ)، دلگیر (دل گیر)، دلکش (دل کش)، ماہنامہ (ماہ نامہ)، کانپور (کان پور)، شاہجہان آباد (شاہ جہان آباد)، بیچارہ (بے چارہ)، بیشتر (بیش تر)، بیتاب (بے تاب)، باغبان (باغ بان)، نیلگوں (نیل گوں)، عقلمند (عقل مند) وغیرہ۔

لیکن بعض لوگ بعض ایسے الفاظ کو بھی ملا کر لکھتے ہیں جو کسی مرکب کا حصہ نہیں ہوتے اور دو الگ الگ الفاظ ہوتے ہیں، مثلاً کیلیے (کے لیے)، انکو (ان کو)، اسلیے (اس لیے)، جسکو (جس کو)۔ ایک بار پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کے پرائیویٹ امیدواروں کی امتحانی کاپیاں جانچنے کے لیے ہمارے پاس بھیجی گئیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لفظوں کو ملا کر لکھنے کی وبا وہاں زیادہ تیزی سے پھیل رہی تھی اور کئی امیدواروں نے کئی الفاظ کو بلا وجہ ملا کر لکھا ہے اور اکثر نے 'ہے کہ' کو بھی ملا کر پوری کاپی میں ہر بار 'ہیکہ' لکھا تھا۔ خیال آیا کہ 'آج شب کو' اور 'کیلے کی گیلی جڑ' کی طرح پوری امتحانی کاپی میں اسی طرح کی لکھائی ہوتی تو پنجاب یونی ورسٹی کو امتحانی کاپیوں کی مد میں لاکھوں کی بچت ہو جاتی کیوں کہ اس طرح دو تین کاپیوں کے بجائے آدھی سے بھی کم کاپی میں پورا پرچہ حل کیا جا سکتا تھا۔ عرض ہے کہ یہ غیر ضروری اور ناروا ہے۔ درخواست ہے کہ ذرا زحمت فرما کر قلم اٹھا لیا کریں کیوں کہ اب آپ اسکول میں نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں اخبارات بھی بعض الفاظ کو قطعی غیر ضروری طور پر ملا کر لکھتے ہیں، جیسے: ہونگے (ہوں گے)، کیا جائیگا (کیا جائے گا)، لیکر (لے کر)، دیکھکر (دیکھ کر)، دیدیا (دے دیا)، بچکر (بچ کر)، کرینگے (کریں گے)، روکدیا (روک دیا)۔ شاید اس کی وجہ اخباری کالم کی تنگ دامانی ہو اور جگہ کم ہونے کی بنا پر، خاص طور پر سرخیوں میں، ملا کر لکھنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ عجیب املا الجھنوں کے علاوہ سوال بھی اٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ سوال کہ کیا انگریزی میں کبھی اس طرح کی بے قاعدگی دیکھی گئی کہ جگہ کی تنگی کے سبب دو لفظوں کے درمیانی فاصلے کو ختم کر دیا گیا ہو اور انھیں ملا کر لکھا گیا ہو؟ نہ صاحب نہ! انگریزی کی بے حرمتی کا تو کوئی معقول انسان تصور بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ انگریزی بیگم صاحبہ ہے اور اردو بے چاری غریب کی جورُو سب کی بھابی۔

☆ کَسَم پُرسی یا کَس مَپُرسی؟

لفظوں کو ملا کر لکھنے کا ذکر نکلا تو خیال آیا کہ ایک اور فارسی ترکیب کا بھی ذکر کر دیا جائے جو اردو میں خاصی استعمال ہوتی ہے یعنی کس مپرسی، جس کا تلفظ ہے کَس مَپُرسی۔ اسے ملا کر کسمپرسی لکھا جاتا ہے لیکن اب بھائی لوگوں نے اس کا تلفظ 'کسم پرسی' کرنا شروع کر دیا ہے یعنی جس طرح 'کتابچہ' (یعنی کتاب + چہ) میں بعض لوگ 'کتا' کو الگ پڑھتے ہیں اور 'بچہ' کو الگ۔ خیال آتا ہے کہ یہ لوگ 'توپچی' (توپ + چی) میں بھی 'تو' کو الگ پڑھتے ہوں گے اور 'پچی' کو الگ۔

اس ترکیب یا مرکب کو ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں پہلے لفظ 'کَس' (کاف پر زبر) ہے، جس کے معنی ہیں کوئی۔ 'مَ' (یعنی میم پر زبر) دراصل فارسی میں نفی کے لیے یعنی 'نہ' یا 'نہیں' کے معنوں میں آتا ہے، مثال کے طور پر 'خواہ مخواہ' میں یہی 'مَ' (میم پر زبر) ہے جو 'نہیں' کے معنی دے رہا ہے اور اسی لیے 'خواہ مخواہ' (خواہ+مَ+خواہ) کے لفظی معنی ہیں: چاہو نہ چاہو (یعنی زبردستی، ناچار، مجبوراً، طوعاً و کرہاً)۔ 'پُرسی' فارسی کے مصدر پُرسیدن سے ہے جس کا مطلب ہے پوچھنا۔ مزاج پُرسی میں بھی یہی پُرسی ہے اور مزاج پُرسی کا مطلب ہے مزاج (یا طبیعت) پوچھنا۔

تو کَس مپرسی کا مطلب ہو گا کسی کا کچھ نہ پوچھنا، یعنی ایسی حالت جس میں کوئی پوچھنے والا نہ ہو، کوئی پُرسانِ حال نہ ہو۔ یہ بے بسی اور بے کسی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

☆ 'کو' یا 'میں'؟

زبان کی صحت کا خیال رکھنے والے اب کتنے ہیں اور اردو زبان کے عام الفاظ کا اب پڑھے لکھے لوگ بھی کتنا غلط استعمال کرتے ہیں اس کا اندازہ یوں لگائیے کہ اب بعض پروفیسر حضرات اور صحافی بھی دن اور تاریخ کے ساتھ 'کو' کے بجائے 'میں' بولتے اور لکھتے ہیں۔

یہ بات تو بچے بھی جانتے ہیں کہ دن کے ساتھ 'کو' آتا ہے، مثلاً پیر کو، منگل کو وغیرہ۔ اسی طرح تاریخ اگر عدد کے ساتھ بتائی جا رہی ہے تب بھی 'کو' آئے گا، مثلاً یوں کہتے ہیں کہ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملے گی۔ اس تاریخ میں اگر سال شامل ہو تب بھی 'کو' لکھا اور بولنا چاہیے، جیسے ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو غالب پیدا ہوئے۔ لیکن ایک پروفیسر صاحب جو ماشاء اللہ ایک جامعہ میں صحافت کا مضمون پڑھاتے ہیں ایک ادبی کانفرنس میں یوں گویا ہوئے: وزیر آغا کا انتقال ۸ر ستمبر ۲۰۱۰ء 'میں' ہوا۔

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

تب سمجھ میں آیا کہ آج کل اردو کے صحافیوں کی اردو اتنی خراب کیوں ہے۔ جب صحافت کا استاد ہی غلط زبان بولے گا تو اس کے شاگرد اخبارات میں اسی طرح اردو زبان کی مٹی پلید کریں گے۔ اب بعض ٹی وی چینلوں پر بھی عام طور پر کسی کی وفات یا پیدائش کی تاریخ یوں ہی بتائی جاتی ہے کہ مثلاً علامہ اقبال ۹/نومبر ۱۸۷۷ء 'میں' پیدا ہوئے۔ اس پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

''اردو'' کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

سیدھی سی بات ہے کہ:

۱۔ جب صرف مہینا ہوگا تو اس کے ساتھ 'میں' بولا اور لکھا جائے گا، جیسے جنوری میں۔

۲۔ صرف سال ہوگا تب بھی 'میں' بولا اور لکھا جائے گا، جیسے ۱۹۴۷ء میں۔

۳۔ مہینا اور سال دونوں ہوں تب بھی 'میں' آئے گا، مثلاً جنوری ۱۹۴۷ء میں۔

لیکن اگر جملے میں:

۱۔ دن آئے گا تو 'کو' لکھا اور بولا جائے گا، جیسے منگل کو۔

۲۔ تاریخ کے عدد کی نشان دہی ہوگی تو 'کو' استعمال کرنا لازمی ہے، جیسے ۲۵/دسمبر کو۔

۳۔ تاریخ اور سال دونوں ہوں تب بھی 'کو' لکھنا پڑے گا، جیسے: ۲۸/مارچ ۱۸۹۸ء کو۔ گویا فلاں ادیب کا انتقال جنوری 'میں' ہوا لیکن فلاں نقاد کا انتقال ۵/جنوری 'کو' ہوا۔ فلاں شاعر اگست 'میں' پیدا ہوئے لیکن فلاں نقاد ۸/اگست 'کو' پیدا ہوئے۔ فلاں صاحب کی شادی دسمبر ۱۹۶۹ء 'میں' ہوئی۔ لیکن فلاں صاحب کی شادی ۲۲/دسمبر ۱۹۶۹ء کو ہوئی۔

اسی طرح فلاں شاعر بدھ 'کو' پیدا ہوئے، فلاں سیاست داں ۲۰/مارچ 'کو' پیدا ہوئے یا وہ ۲۰/مارچ ۱۹۴۰ء 'کو' پیدا ہوئے۔ فلاں لڑکی کی رخصتی اس مہینے کی دسویں تاریخ 'کو' ہوگی۔ یعنی جب دن یا تاریخ کا معاملہ ہوگا تو 'کو' بولا اور لکھا جائے گا۔ غالب نے کہا کہ:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

غالب نے یہ نہیں کہا کہ قیامت 'میں' ملیں گے بلکہ قیامت 'کو' ملیں گے کیوں کہ یہاں قیامت کے 'دن' کا ذکر ہے، جیسا کہ دوسرے مصرعے سے بھی ظاہر ہے۔ لیکن اگر 'دن' کا لفظ نہ ہو تو قیامت 'میں' کہا جائے گا، جیسے غالب ہی کا شعر ہے:

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

قیامت کے ساتھ 'میں' کے استعمال کی سند کے لیے بالِ جبریل میں اقبال کا مصرع دیکھیے:

ع قیامت میں تماشا بن گیا میں

لیکن قیامت تو اس دن آئی تھی جب اردو کی جگہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنادیا گیا تھا۔ اب روئیے بیٹھ کر اس دن 'کو'۔

☆ معنوُن نہیں مُعَنوَن

بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی دیکھا ہے کہ وہ مُعَنون (میم پر پیش، عین پر زبر، نون ساکن، واو کے اوپر زبر) کو واو معروف کے ساتھ یعنی معنوُن پڑھتے ہیں اور مثلاً یوں کہتے ہیں کہ فلاں صاحب نے اپنی کتاب کو فلاں سے 'معنوُن' کیا ہے۔ لیکن ان معنوں میں 'معنوُن' بالکل غلط ہے بلکہ 'المنجد' کے مطابق 'المعنوُن' (واو معروف) کا مطلب ہے دیوانہ اور اسٹین گاس نے بھی 'معنوُن' (واو معروف) کا مفہوم پاگل اور دیوانہ ہی لکھا ہے۔

جب کہ مُعَنوَن (مُ عَ ن وَ ن) کے معنی ہیں: عنوان کیا ہوا۔ کسی کتاب کو کسی سے معنوَن کرنے کا مطلب ہے اس کا انتساب اس کے نام کرنا۔ اس کو 'مُعَنوَن' (مُعَن وَن) پڑھنا چاہیے۔ معنون کا مادّہ 'ع-ن-و-ن' ہے۔ عربی میں افعال کے مادّے عموماً سہ حرفی ہوتے ہیں جنھیں ثُلاثی کہتے ہیں اور کچھ افعال کے مادے چہار حرفی ہوتے ہیں جنھیں رُباعی کہتے ہیں۔ معنون بھی ان افعال میں شامل ہے جن کا مادہ چہار حرفی ہے۔

☆ مُہَذِّب یا مُہَذَّب؟

عربی میں ایک لفظ ہے: تہذیب۔ اس کا مادہ 'ہ-ذ-ب' ہے۔ اسٹین گاس کے مطابق ہذب (ہ مفتوح، ذال ساکن) کے لفظی معنی ہیں: درخت کی شاخیں تراشنا، کھجور کے درخت سے فالتو کھال کو الگ کرنا، صاف کرنا، درست کرنا۔ اسی سے تہذیب اور مہذب ہیں۔ احمد دین نے اپنی کتاب 'سرگذشتِ الفاظ' میں لکھا ہے کہ جب تعلیم و تربیت کے ذریعے اَخلاق سے اَسقام کو دور کردیا جائے (گویا انھیں تراش کر صاف کردیا جائے) تو انسان مہذب (ذال مفتوح) کہلانے کا حق دار ہو جاتا ہے۔

مُہَذَّب (میم پر پیش، ہ پر زبر، ذال پر زبر تشدید کے ساتھ) اور مُہَذِّب (ذال کے نیچے زیر تشدید کے ساتھ) دونوں درست ہیں مگر دونوں کے معنی مختلف ہیں۔ البتہ اب لوگ اس فرق کو سمجھے بغیر شائستہ، بااخلاق اور آداب و تہذیب کا خیال رکھنے والے کو بھی 'مہذِّب' (ذال کے نیچے زیر) کہہ دیتے ہیں حالاں کہ اس کا مطلب ہے تہذیب سکھانے والا، شائستگی سکھانے والا۔ لیکن جو تہذیب سیکھا ہوا ہو، جس کی تہذیب کی گئی ہو یعنی تہذیب یافتہ ہو، آداب اور شائستگی کا خیال رکھنے والا ہو اسے 'مہذَّب' (ذال کے اوپر زبر) کہتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی نے جب ان لوگوں پر طنز کیا جو مغربی تہذیب کو اپنانا مہذَّب ہونے کی نشانی سمجھتے تھے تو کہا:

ہوئے اس قدر مہذَّب، کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے اسپتال جا کر

کہنا یہ مقصود ہے کہ جو تہذیب یافتہ ہو وہ مہذَّب (ذال کے اوپر زبر) ہے اور جو دوسروں کو تہذیب سکھائے وہ مہذِّب (ذال کے نیچے زیر) ہے۔

☆ 'نا' یا 'نہ'؟

دونوں صحیح ہیں لیکن دونوں کا استعمال الگ ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اب بڑے بڑے لکھنے والے اور بعض نامور صحافی (بلکہ آج کی زبان میں سینیئر صحافی اور تجزیہ کار، کیوں کہ جونیئر صحافی یا تجزیہ کار تو کوئی ہوتا ہی نہیں ہے) بھی ان دو الفاظ کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتے ہیں۔ 'نا' تو ایک سابقہ ہے جو نفی کے لیے آتا ہے، جیسے نااہل، ناتجربہ کار، نادان، ناگوار، ناشائستہ وغیرہ۔ لیکن 'نہ' حرفِ نفی ہے اور 'نہیں' کے معنی میں آتا ہے۔ کئی کالم نگار اب 'نہ صرف' کو 'ناصرف' لکھتے ہیں اور اس طرح ثابت کردیتے ہیں کہ وہ اردو کے معاملے میں 'نااہل' ہیں۔ اردو میں خاصی کثیر تعداد میں ایسے محاورے، مرکبات یا ضرب الامثال رائج ہیں جن میں 'نہ' استعمال ہوتا ہے، مثلاً نہ اساڑھ سوکھے نہ ساون ہرے (یعنی ہر وقت ایک سا حال ہے)، نہ آدم نہ آدم زاد (یعنی ہُو کا عالم)، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن (یعنی نہ جاسکتے ہیں نہ ٹھہر سکتے ہیں، کوئی کوشش کرتے نہیں بنتی) وغیرہ، ان سب میں نہ کی بجائے 'نا' لکھنا غلط ہوگا۔ ذوق کا بڑا مشہور شعر ہے:

لائی حیات، آئے قضا، لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

اس میں بھی 'نہ' کی بجائے 'نا' لکھنا درست نہ ہوگا۔

اسی طرح 'نہ کہ...'، مثلاً: میں نے وہ کتاب کہی تھی نہ کہ یہ۔ اس کو 'نا کہ' لکھنا درست نہ ہوگا۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ
A-337، بلاک 19، گلشنِ اقبال، کراچی، پاکستان
drraufparekh@yahoo.com

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میاں من و تو (تحقیقی و تنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات و مضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق و توازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری و تاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سر اُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-
سیر المنازل (مرزا سنگین بیگ)	شریف حسین قاسمی	600/-
محرابِ تمنا	فطرت انصاری	200/-
مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر...	میر حسین علی امام، یاسمین سلطانہ فاروقی	700/-
لفظ (کلیاتِ زہرا نگاہ)	زہرا نگاہ	500/-
In This Live Desolation (Autobiography of Akhtarul Iman)	ترجمہ: بیدار بخت	500/-
سخنِ افتخار (کلیاتِ افتخار عارف)	افتخار عارف	1500/-
گواہی (شاعری)	گوہر رضا	500/-
میری زمین کی دھوپ (ہندی)	ونود کمار ترپاٹھی بشر	400/-
کھُلا دروازہ	ڈاکٹر نریش	250/-
ٹیپو سلطان کا خواب (گریش کرناڈ)	محبوب الرحمان فاروقی	300/-
اپنی دنیا آپ پیدا کر	غلام حیدر	900/-
وقائعِ بابر	ظہیر الدین محمد بابر	1000/-
In This Poem Explanateions of Many Modern Urdu Poem (میراجی)	بیدار بخت	600/-
میری زمین کی دھوپ	ونود کمار ترپاٹھی بشر	600/-
اُردو شاعرات اور نسائی شعور	ڈاکٹر فاطمہ حسن	330/-
مجھے اک بات کہنی ہے	شاہد کمال	400/-
انتخابِ غالب	امتیاز علی عرشی	600/-
باغِ گلِ سرخ	افتخار عارف	300/-
رفتگاں کا سراغ	سرور الہدیٰ	450/-
کلّیاتِ مصطفیٰ زیدی	سرور الہدیٰ	900/-
اے زمینِ وطن اور دیگر مضامین	ڈاکٹر نریش	225/-

محمود سروش

اپنے علم سے بے نیاز
ایک عالم، ایک شاعر

ندیم صدیقی

محمود سروش (2 اپریل 1921 تا 4 جولائی 1996) عالم شخص تھے۔ ان کے علم وادب سے ممبئی ہی کے لوگ نہیں بلکہ دہلی کے صاحبِ نظر بھی واقف تھے، اس کے باوجود علم سے بے نیازی محمود سروش کی ایک صفت تھی۔ انھوں نے اپنے بھائیوں سبطِ حسن رضوی، یعقوب حسن رضوی وغیرہ کے لیے فلمیں بھی لکھیں اور نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ ممبئی کے مشہور روزنامہ 'انقلاب' کے لیے وقائع نگاری (جسے آج نامہ نگار یا رپورٹر کہا جاتا ہے) کی ذمے داری بھی وہ نبھا چکے تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ ممبئی بھر میں مشہور تھا جس میں علمی وادبی کتب کا ایک بیش بہا خزانہ تھا جو اَب رضوی کالج (باندرہ) میں منتقل ہو چکا ہے۔ سروش مرحوم کے ذوقِ مطالعہ کے بارے میں ایک واقعہ یہ بھی یہاں درج ہوجائے کہ مصحفی پر وہ کچھ کام کررہے تھے۔ مصحفی کی ایک کتاب کی انھیں تلاش تھی جو عام اطلاع کے مطابق شہر میں کسی کے پاس نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ فلاں صاحب کے پاس وہ کتاب ہے مگر وہ صاحب اپنی کتاب کسی کو نہیں دیتے۔

محمود حسن سروش نے کہا: 'ارے بہت ہوگا وہ صریح انکار کردیں گے۔ میں ان کے پاس جاؤں گا ضرور اور عرض بھی کروں گا، اگر مولا نے چاہا تو ہوسکتا ہے کہ میرے ساتھ وہ نہ ہو جو وہ دوسروں کے ساتھ رویّہ روا رکھتے ہیں۔ لازم نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔'

مختصر یہ کہ محمود سروش ان کے پاس گئے اور ان کے ذخیرۂ کتب کو دیکھ کر موصوف کے ذوقِ علم کی تعریف کی، شخصِ مذکور نے بھی کچھ سوال وجواب کیے تو اُس پر محمود سروش کا بھی ذوقِ علم عیاں ہوا اور اب اس نے کہا: عزیزم! میں آپ کی مطلوبہ کتاب دے سکتا ہوں مگر ایک شرط کے ساتھ۔ محمود سروش نے شرط پوچھی۔ جواب ملا کہ شام کو کتاب دوں گا اور صبح وہ کتاب آپ مجھے واپس کریں گے۔ محمود سروش نے یہ شرط مان کر ان کا شکریہ ادا کیا اور کوئی ایک عشرے تک یہ سلسلہ چلتا رہا کہ وہ ہر شام اُس شخص کے گھر جاتے اور کتاب لاتے اور صبح وہی کتاب واپس کرنے جاتے اور پھر دوسری شام وہی عمل اور پھر صبح کو کتاب کی واپسی... یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ وہ شخص ممبئی کے ڈونگری علاقے میں رہتا تھا اور محمود سروش (ممبئی کے مضافات) باندرہ میں۔ یہ بھی واضح ہوجائے کہ باندرہ سے ڈونگری کا علاقہ کوئی تیس کلومیٹر تو ہوگا ہی۔ ہم نے محمود سروش کی ذاتی لائبریری کا ذکر کیا ہے گھر کی دیواروں میں فرش سے لے کر چھت تک کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ایک بار ہم گئے، ہم نے اپنی ایک غزل سنائی اور یہ کہا کہ 'اس غزل کے بارے میں زیب غوری کا کہنا ہے کہ اس کے مصرعے مختلف الوزن ہیں۔ سروش صاحب! آپ بتائیں کہ کیا زیب صاحب کا کہنا صحیح ہے؟...'

انھوں نے پوری غزل سُنی اور پھر کہا: وہ تپائی لیجیے اور اُس طرف کھڑے ہوجائیے، ہم تپائی پر کھڑے ہوگئے۔ اب کہنے لگے کہ اوپر سے تیسری صف میں دیکھو دائیں سے دسویں کتاب ہوگی۔ نکالو... ہم نے کتاب نکالی تو انھوں نے کتاب کا نام پوچھا۔ ہم نے کتاب کا نام پڑھ کر سنایا تو کہنے لگے: اس کتاب کا 36 واں صفحہ کھولو۔ وہ صفحہ کھولا تو کہا گیا اب آٹھویں سطر سے پڑھنا شروع کرو۔ مختصر یہ کہ بحر کی پوری تقطیع تھی ان سطروں میں۔ اس سے اندازہ ان کی کتب بینی کا لگائیے اور مطالعے کے ہاضمے کا اَتا پتا بھی پائیے۔ پڑھتے تو ہم بھی ہیں اور انہی کی نقل میں ہم نے بھی کتابیں جمع کر رکھی ہیں مگر وہ مطالعہ جس کا ذکر ابھی ہوا وہ ہم میں مفقود ہے۔ اُردو، فارسی اور انگریزی کا یہ مثالی عالم جو عروض اور زبان دانی میں اپنی مثال آپ تھا، جس کے زمانے میں مہاراشٹر اردو اکادمی بھی قائم ہوچکی تھی مگر اسے نہ تو کبھی اکادمیِ مذکور کی رکنیت کی پیش کش ہوئی اور نہ ہی کوئی اکادمی ایوارڈ دِیا گیا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہم نے اسے کبھی کسی ایوارڈ وغیرہ کا طالب بھی نہیں پایا اور اس سے بڑی بات یہ تھی کہ علمی یا دانشوری کے زعم سے دور بہت دور تھا وہ۔ اسے اس کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ لوگ اسے دانشور یا شاعرِ اعظم سمجھیں۔ ایک بار کسی تذکرے میں اس کا ذکر نہیں تھا، شاگرد جز بز ہوئے تو اس نے فوراً سے پیش تر سب کو ان لفظوں میں ڈانٹ دیا:

'لوگ سمجھیں گے کہ مَیں ہنگامہ کروا رہا ہوں اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو اس معاملے میں خاموش رہو، ورنہ میرے طوطے سمجھے جاؤ گے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ علم ایک نور ہے اور ظلمت، نور سے تعلق رکھنے والے کو کبھی اپنے حصار میں نہیں لے سکتی۔ علم اپنے آپ میں خود ایک اعزاز ہے، ایک ایوارڈ ہے۔ یہ جو ایوارڈز کی خبریں آرہی ہیں یہ خبریں ہی ہیں، یاد رکھو خبر باسی بھی ہوجاتی ہے مگر علم کبھی باسی نہیں ہوتا اور عزت علم ہی سے ملتی ہے۔'

محمود سروش کے درج ذیل اشعار جو اُردو دنیا میں زبان زدِ خاص وعام ہیں یہ اور بات کہ اکثر لوگوں کو، ان اشعار کے خالق کا نام نہیں معلوم:

اب مجھ سے کاروبار کی حالت نہ پوچھیے
آئینہ بیچتا ہوں مَیں اندھوں کے شہر میں

زمیں کا دِل بھی یقیناً کسی نے توڑا ہے
بلا سبب تو یہ چشمے اُبل نہیں سکتے

ویران کس قدر ہے یہ بازار اے سروشؔ!
شاید یہاں متاعِ ہنر بیچتے ہیں لوگ

اور یہ نعتیہ رباعی بھی اِنہی محمود سروش کی فکر کا نتیجہ ہے:

اوروں کا شرف ان سے ملایا، نہ ملا
اغیار میں ایسا کوئی آیا؟ نہ ملا
دنیا نے بہت ڈھونڈا محمدؐ کا جواب
ثانی تو بڑی چیز ہے، سایہ نہ ملا

سروش مرحوم کے ایک شاگردِ عزیز عثمان غنی عادلؔ نے آخری دِنوں میں ان کا ایک شعری مجموعہ 'متاعِ ہنر' کے نام سے شائع کروادِیا تھا ان کی دختر اور ہماری (شبیر فاطمہ) شبّو آپا نے اپنے بابو کی رثائی شاعری کی ایک کتاب 'متاعِ زندگی' اپنے صرفے سے شائع کی۔

'متاعِ ہنر' کے ذکر پر ایک علمی واقعہ بھی یہاں درج ہوجائے کہ اس شعری مجموعے پر کچھ لکھنے کے لیے علی سردار جعفری سے عثمان غنی عادلؔ نے گزارش کی اور مسودہ علی سردار جعفری کو دے آئے۔ جب عادلؔ مرحوم، ایک دن جعفری کا مضمون لینے سیتا محل پہنچے تو جعفری مرحوم نے اپنے مضمون کے ساتھ مسودہ بھی دیا اور کہا کہ عادل صاحب! محمود سروش نے ایک مطلعے میں لفظ سِہَر (Sihar) اِستعمال کیا ہے، یا تو مَیں اس لفظ کے معنی سے نا آشنا ہوں یا پھر یہ لفظ غلط ہے۔

عادلؔ مرحوم بہت بجھے بجھے سے ہمارے پاس آئے۔ ہوٹل میں لے گئے اور سارا ماجرا سنایا۔ ہم بھی حیران کہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ محمود سروش اور غلط لفظ کا استعمال...! عادل مرحوم نے مسودے کی ایک غزل میں مطلعے کی نشان دہی کی، ہم نے اس کا پہلا مصرع پڑھا، اتفاق کہ مصرعے کا وہ اوّلین لفظ ہی تھا، اب ہمیں بھی اطلاع ملی کہ 'میاں ندیمؔ! تم بھی اس لفظ سے بے خبر ہو۔' 'سِہَر' اُٹھتا ہے دِل پہلے پہل جب پیار پاتا ہے، دیر تک ہم دونوں حیران پریشان رہے۔ چائے پینے کے بعد جیسے کسی نے سوئی چبھوئی کہ 'میاں! ذرا دوسرا مصرع بھی تو دیکھو اور پڑھو کہ اس میں کیا کہا گیا ہے...!'

دوسرا مصرع پڑھا تو پشیمانی کی کیفیت سے گزرنا پڑا کہ مصرعۂ ثانی میں قافیے کی صورت، شاعر نے خود اس لفظ کے معنی بتا دِیے تھے۔ ہم نے جب عثمان غنی عادلؔ کو بتایا تو وہ اچھل پڑے اور جیسے ان کی دِلی مراد پوری ہوگئی ہو، فوراً ہوٹل کے بیرے کو بلا کر آرڈر دِیا کہ 'میرے ندیمؔ کے لیے کوئی مٹھائی لاؤ۔ مَیں تو پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ سرکار (سروش مرحوم کے شاگرد اسی لفظ سے اپنے اُستاد کو یاد کرتے تھے) اور غلط لفظ...!! یہ کیوں کر ممکن ہے...؟' ...اس مطلع کا ثانی مصرع یوں تھا:

سِکورہ بھیگ کر پانی میں جیسے سنسناتا ہے

جو لوگ یوپی کے دیہات میں رہ چکے ہیں ان میں اکثر اصحاب، ہندی کے اس لفظ 'سِہَر' سے ضرور آشنا ہوں گے۔ مِٹّی کے برتن میں جب پہلی بار پانی پڑتا ہے تو ایک آواز سَن کی سی آتی ہے اسی کیفیت کو 'سِہَر' کہتے ہیں۔ جعفری مرحوم بلرام پور کے رہنے والے تھے اور وہاں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

'سردار جعفری اس لفظ سے نا آشنا تھے...'

یہ سوچ کر ہمیں حیرت رہی مگر کچھ دِنوں بعد جب یہ معلوم ہوا کہ سردار جعفری دماغ (برین) کی کسی گمبھیر بیماری میں مبتلا ہیں اور اس عارضے نے ان کی یادداشت کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے، تو سمجھ میں یہ بات آئی کہ جب وہ محمود سروش کا مسودہ دیکھ رہے تھے تو یہ عارضہ انھیں اپنی گِرفت میں لے چکا تھا۔

محمود سروش ایک عالم اور اعلا درجے کے شاعر و ادیب تو تھے ہی مگر ایک شفیق شخص بھی ان کے اندرون میں تھا۔ ہمارے بزرگ ان کے ساتھ عزت وتکریم سے پیش آتے تھے۔ یعنی ہم ان کے سامنے بہرحال خرد ہی تھے۔ ایک دن انجمنِ اسلام اسکول (نزد وِی ٹی ریلوے اسٹیشن) کے باہر مل گئے۔ ہم نے سلام کیا انھوں نے گھر کے لوگوں کی خیریت وغیرہ دریافت کی۔ بعدہٗ ہم نے عرض کیا، سروش صاحب! چائے پی جائے۔ انھوں نے کہا: 'ہاں ہاں'۔

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

اردو دُنیا

11ہزار سے زائد اساتذہ کو تقررنامے حوالے کیے جائیں گے: ریونت ریڈی

حیدرآباد (6 اکتوبر)۔ تلنگانہ کے وزیرِ اعلا ریونت ریڈی نے واضح کیا کہ حیدرآباد اور مضافاتی علاقوں کی ترقی کے لیے حکومت کے شروع کردہ منصوبوں میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ وزیرِ اعلا نے اقتدار کے 90 دن میں 30 ہزار اسامیوں پر تقرری مکمل کرنے کا دعوا کیا اور کہا کہ 9 اکتوبر کو ڈی ایس سی سے منتخب گیارہ ہزار 63 اساتذہ کو تقررنامے حوالے کیے جائیں گے۔ وزیرِ اعلا نے سابق حکومت پر بے روزگاری کے خاتمے کے مسئلے کو نظرانداز کرنے کا الزام عائد کیا اور کہا کہ نوجوانوں اور طلبہ نے علاحدہ تلنگانہ جدوجہد میں اپنی قربانیوں کے ذریعے علاحدہ ریاست کے قیام کو یقینی بنایا۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ سات تا نو برسوں میں تقررات کے لیے اشتہارات جاری کیے گئے لیکن تقرر نہیں ہوا۔ کانگریس نے بے روزگار نوجوانوں سے ملازمتوں کے سلسلے میں جو وعدہ کیا تھا اس کی تکمیل شروع ہوچکی ہے۔ وزیرِ اعلا نے کہا کہ یہ محض ایک ملازمت ہی نہیں بلکہ عہدیداروں کو ریاست کی تعمیرِنو میں اپنا رول ادا کرنا چاہیے۔ وزیرِ اعلا نے تقرری میں سابق حکومت کی ناکامی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور سوال کیا کہ 2015 کے اشتہار کے ذریعے منتخب امیدواروں کا ابھی تک تقرر کیوں نہیں کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ دسہرہ سے قبل 9 اکتوبر کو لال بہادر اسٹیڈیم میں ڈی ایس سی منتخب 11063 اساتذہ کو تقررنامے حوالے کیے جائیں گے۔ یہ حکومت کی ذمے داری ہے۔

(سیاست۔حیدرآباد)

جلگاؤں ریلوے اسٹیشن کا نام اُردو میں بھی لکھا جائے
اُردو والوں کا مطالبہ

جلگاؤں (8 اکتوبر)۔ جلگاؤں اسٹیشن پر اردو زبان میں لکھا ہوا نام ہٹا دیا گیا جس سے مقامی اردو دوست شہریوں میں غم و غصہ ہے۔ اس فیصلے پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اردوداں شہریوں نے ریلوے انتظامیہ ڈی آر ایم دفتر بھوساول میں عہدے داروں سے ملاقات کرکے دوبارہ اردو زبان میں نام لکھے جانے کا مطالبہ کیا۔ شہر کے کچھ سرکردہ شہریوں نے 'انیائے اتیاچار وِرودھی سنگھٹن مہاراشٹر' کے پرچم تلے مرکزی ریلوے حکام کو میمورنڈم دیا جس میں کہا گیا کہ ابھی تک ریلوے اسٹیشن کا نام چار زبانوں یعنی ہندی، مراٹھی، انگریزی اور اُردو میں لکھا ہوا تھا، تاہم حال ہی میں تعمیراتی و درستی کے عمل کے دوران اردو زبان میں لکھے گئے نام کو ہٹا دیا گیا۔ محضر میں کہا گیا کہ اردو زبان وطنِ عزیز بھارت کی ایک اہم اور قدیم زبان ہے، ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ ملک کے کئی ریلوے اسٹیشنوں پر آج بھی اردو زبان میں نام لکھے ہوئے ہیں، لہٰذا جلگاؤں اسٹیشن سے اسے ہٹانا اردو جاننے والے شہریوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس محضر پر جمیل شیخ، حسین حسن خاں، عمر کاکر، عرفان بھائی اور وسیم خاں کے دستخط ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر اردو زبان میں نام دوبارہ نہ لکھا گیا تو دستوری اور جمہوری طریقے سے احتجاج کیا جائے گا۔ (اردو ٹائمز۔ممبئی)

این سی ای آر ٹی کی درسی کتابیں اب امیزون پر بھی دستیاب ہوں گی
درسی کتابوں کی آن لائن فروخت کے لیے امیزون کے ساتھ این سی ای آر ٹی کا معاہدہ

نئی دہلی (9 اکتوبر)۔ آج قومی تعلیمی پالیسی 2020 پر مبنی این سی ای آر ٹی کی نئی درسی کتابوں کے آن لائن فروخت کے لیے امیزون کے ڈیجیٹل اسٹور کے ساتھ معاہدے پر دستخط کیا گیا۔ مرکزی وزیرِ تعلیم جناب دھرمیندر پردھان کی رہنمائی میں این سی ای آر ٹی کے سکریٹری جناب امن شرما نے اس معاہدے پر دستخط کیا۔ نئی دہلی میں واقع وزارتِ تعلیم کے کوشل بھون میں منعقدہ تقریب میں امیزون کے نمائندوں کی موجودگی میں یہ معاہدہ ہوا۔ اس موقعے پر سکریٹری، اسکولی تعلیم و خواندگی محکمہ جناب سنجے کمار، این سی ای آر ٹی کے ڈائرکٹر پروفیسر دنیش پرساد سکلانی اور وزارتِ تعلیم اور این سی ای آر ٹی کے دیگر سینئر افسران موجود تھے۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے معزز وزیرِ تعلیم جناب دھرمیندر پردھان نے کہا کہ تعلیم معیاری ہونی چاہیے، عالمگیر ہونی چاہیے، قابلِ رسائی ہونی چاہیے، سستی ہونی چاہیے اور جامع بھی ہونی چاہیے۔ ان ہی مقاصد کو بروے کار لانے کے لیے ہم سب کی اجتماعی کوششوں کی بدولت آج کی اس پہل کو ساکار ہوتا ہوا ہم دیکھ پا رہے ہیں۔ آج کی نئی نسل آن لائن خریداری کی طرف زیادہ متوجہ ہے۔ وہ ہر چیز پہلے آن لائن سرچ کرتی ہے اور الٹی سیدھی چیزوں کی خریداری کے سبب اپنے والدین سے ڈانٹ بھی سنتی ہے۔ ایسے میں اگر کتابوں کی خریداری کو آسان بنا دیا جائے تو والدین کے لیے ان کی خریداری کا یہ عمل باعثِ اطمینان ہوگا۔ جناب پردھان نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا کہ سرکار کی ترجیحات میں زندگی کو آسان بنانا (Ease of Living) شامل ہے، اس کے تحت ہندستان کے سبھی گھروں میں بچے بچیاں پڑھیں، ان کو نئی کتابیں وقت پر ملیں، آسانی سے ملیں اور سستی ملیں، اسی کو یقینی بنانے کی طرف ہم آج ایک قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہندستان ڈیجیٹل میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور آج این سی ای آر ٹی اور امیزون نے مل کر ڈیجیٹل مارکٹنگ کو لے کر ایک نئی پہل کی ہے۔ اس کے ذریعے اُنیس ہزار پانچ سو پن کوڈ ایریا میں یہ خدمات دستیاب کرائی جائیں گی۔ سابقہ تمام ذرائع بھی بدستور کتابیں فراہم کرتے رہیں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ این سی ای آر ٹی سالانہ پانچ کروڑ کتابوں کے مقابلے اگلے تعلیمی سال سے پندرہ کروڑ کتابیں فروخت کرے گی تو یہ یقینی بنایا جائے گا کہ امیزون کے ذریعے بھی ایم آر پی پر ہی ساری کتابیں طلبہ تک پہنچے۔ وزیرِ تعلیم نے کہا کہ 1963 سے لے کر اب تک این سی ای آر ٹی نے دو سو بیس کروڑ کتابیں طلبہ تک پہنچائی ہے۔ یہ بھی اپنے آپ میں ایک عالمی ریکارڈ ہی ہے۔ شاید ہی دنیا کے کسی اور ملک نے اس ریکارڈ کو عبور کیا ہو۔ اسکولی تعلیم و خواندگی محکمہ کے سکریٹری جناب سنجے کمار نے اپنے خطاب میں کہا کہ این سی ای آر ٹی کے ذریعے تیار کی جارہی کتابوں کے تعلق سے اچھے فیڈ بیک ہمیں سننے کو مل رہے ہیں، لیکن ان اچھی کتابوں کو بچوں تک پہنچانے کی کارروائی بھی یکساں طور پر اہم ہے۔ یہ کتابیں اتنی اچھی ہیں کہ ملک کی دیگر ریاستیں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقے بھی ان کتابوں کو اپنانے لگے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس پہل کے ذریعے تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے ہی مطلوبہ تعداد میں اسکولوں کو کتابیں فراہم کرنے میں ہم کامیاب ہوسکیں گے۔ امیزون کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے امیزون انڈیا کے وائس پریزیڈنٹ جناب سوربھ سریواستو نے کہا کہ اب تک امیزون دنیا بھر میں کتابوں کے دو کروڑ ٹائٹل دستیاب کرا رہا تھا، این سی ای آر ٹی کے ساتھ یہ معاہدہ ہمارے بزنس کو نئی اونچائیوں تک لے کر جائے گا اور ہم انڈیا کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش میں ایک چھوٹا سا تعاون پیش کرکے اس بڑے مہم کا حصہ بننے جا رہے ہیں۔ اس پر ہم خوش ہیں اور پُرامید بھی۔ این سی ای آر ٹی کے ڈائرکٹر پروفیسر دنیش پرساد سکلانی نے مہمانوں اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ امیزون کے ساتھ اس معاہدے سے طلبہ کو وقت پر آسانی سے معیاری کتابیں دستیاب ہوں گی اور ایم آر پی میں ہی فراہم ہوں گی۔ (تاثیر۔پٹنہ)

دہلی یونی ورسٹی نے متعدد اسامیوں کے لیے اشتہار جاری کیا
دیگر مضامین کے ساتھ اردو، فارسی اور عربی کی بھی اسامیاں شامل

نئی دہلی (4 اکتوبر)۔ مرکزی یونی ورسٹیوں میں اردو، عربی اور فارسی میں خالی اسامیوں کو پُر نہ کیے جانے پر روزنامہ 'انقلاب' کی رپورٹ کے بعد دہلی یونی ورسٹی کی انتظامیہ حرکت میں آگئی ہے اور اس نے عربی، اردو اور فارسی سمیت کُل 37 شعبوں کی 146 اسامیوں کو پُر کرنے کا اشتہار جاری کیا ہے۔ 24 اکتوبر تک درخواست جمع کرنے کی آخری تاریخ ہے۔ اسسٹنٹ پروفیسر کا اشتہار عربی اور اُردو کو چھوڑ کر دیگر مضامین کی خالی اسامیوں پر مشتمل ہے، جس میں فارسی بھی شامل ہے۔ عربی شعبے میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے لیے تین اسامیوں کا اشتہار جاری کیا گیا۔ اسی طرح فارسی کے شعبے میں دو ایسوسی ایٹ پروفیسروں کے لیے اسامیاں نکالی گئی ہیں۔ اردو میں بھی سات اسامیوں کے لیے اشتہار نکالا گیا۔

واضح رہے کہ روزنامہ 'انقلاب' نے مرکزی یونی ورسٹیوں میں اساتذہ کی تقرری میں غیرضروری تاخیر پر رپورٹ شائع کی تھی جن میں متعدد ریسرچ اسکالروں نے متعلقہ شعبوں اور یونی ورسٹی انتظامیہ پر کئی الزامات عائد کیے تھے۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ تقرری کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا گیا کہ اشتہارات نکالے جانے کے باوجود کئی سالوں تک تقرری عمل کا نہیں ہو پاتا۔ اس پر دہلی یونی ورسٹی اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نے اپنی صفائی بھی پیش کی تھی۔ رپورٹ کا مقصد اردو، عربی اور فارسی کے شعبوں میں تقرری میں غیرضروری تاخیر اور اس کے نتیجے میں تعلیم و ریسرچ کے نقصان پر انتظامیہ کی توجہ مبذول کرانا تھا۔ امکان ہے کہ یونی ورسٹی مستعدی کے ساتھ ان تقرریوں کو عملی جامہ پہنائے گی۔ (انقلاب۔دہلی)

'اُردو خواندگی مراکز' جلد بحال ہونے کی امید

نئی دہلی (12 اکتوبر)۔ دہلی اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام چلنے والے اردو خواندگی مراکز جلد ہی بحال ہوں گے۔ 2020 میں کورونا کے بعد سے مراکز بند پڑے ہیں۔ اگست میں دہلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کی تشکیلِ نو کے بعد اردو خواندگی مراکز کے استادوں نے وائس چیئرمین سے ملاقات کی تھی۔ ذرائع کے مطابق حال ہی میں دہلی اردو اکادمی کی ایگزیکٹیو کونسل کی میٹنگ میں اردو خواندگی مراکز کو کھولنے کی حمایت کی ہے۔ ابھی اس سلسلے میں تھوڑی کاغذی کارروائی باقی ہے جس کے بعد اشتہار جاری کر دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ دہلی اردو اکادمی 150 اردو خواندگی مراکز کھولنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو خواندگی مراکز کھولنے کے لیے میرٹ کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے جس میں داخلہ جاتی امتحان بھی شامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مرکز کھولنے کے لیے دیگر کئی شرائط بھی شامل ہوتی ہیں جن کو پورا کرنے پر مرکز کھولنے کی منظوری دی جاتی ہے۔ اردو خواندگی مراکز چلانے والے اساتذہ کو ہر ماہ پانچ ہزار روپے کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ اردو کی ترویج و فروغ دہلی اردو اکادمی کے بنیادی کاموں میں سے ایک ہے۔ اردو خواندگی مراکز میں کوئی بھی غیراردوداں شخص داخلہ لے سکتا ہے اس کے لیے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی ہے۔ (انقلاب۔دہلی)

حکومت سے ہر سال اساتذہ کی تقرری کی اُمید

ڈی ایس سی 2024 کے منتخب اُردو اساتذہ کو مبارک باد

نظام آباد (9 اکتوبر)۔ ریاست تلنگانہ میں ایک طویل عرصے کے بعد مختلف محکموں میں موجودہ حکومت کی جانب سے تقررات عمل میں لائے جارہے ہیں اور ریاستی حکومت نے سرکاری اسکولوں میں اساتذہ کے تقرری کے لیے حال ہی میں تحریری امتحان منعقد کیا تھا اور اس کے نتائج بھی جاری کردیے ہیں اور اب بڑے پیمانے پر تقرر نامے امیدواروں کو دیے جارہے ہیں۔ تلنگانہ اسٹیٹ مائناریٹی ایمپلائز سروس ایسوسی ایشن (TSMESA) کے ریاستی اعزازی صدر خواجہ معین الدین، ضلع نظام آباد کے صدر جناب انور رفیقی اور جناب عارف الدین کے علاوہ دیگر قائدین نے ڈی ایس سی 2024 کے نومنتخب اردو اساتذہ کو مبارک باد دی ہے اور امید ظاہر کی کہ وزیر اعلا مسٹر اے۔ ریونت ریڈی کے دور حکومت میں ہر سال اساتذہ کے تقرر ہوں گے اور ریاست تلنگانہ میں اردو میڈیم سرکاری اسکولوں میں ریزرویشن کے نام پر محفوظ ایس سی، ایس ٹی کی اردو اسامیوں کو Dereserve کرتے ہوئے ان اسامیوں کو جنرل زمرے میں تبدیل کرتے ہوئے تقرر عمل میں لانے کے لیے ممکنہ اقدام کریں گے اور ساتھ ہی اردو اسکولوں میں منظور شدہ اساتذہ کی اسامیوں کی تفصیلات محکمۂ تعلیم کے اعلا عہدیداروں سے طلب کرتے ہوئے تقرری کے لیے اقدام کیے جائیں گے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

'جدید اردو نظم: سمت و رفتار' کے عنوان سے شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ میں قومی سمینار منعقد

پٹنہ (5 اکتوبر، پریس ریلیز)۔ ہم عصر نظموں میں ملکی اور عالمی مسائل پر ایسی نظمیں کہی جارہی ہیں، جن میں زندگی اور اس کی بقا کی فکر زیادہ ہے۔ بابری مسجد، گودھرا سانحہ، کووڈ وبا، تانیثیت، ایران واسرائیل جنگ اور نائن الیون جیسے واقعات کو بنیاد بناکر انسانی زندگی اور انسانی مسائل پر نظمیں کہی جارہی ہیں۔ نئی نظم کے شاعروں کی ذمہ داریاں پہلے کے شاعروں کے مقابلے زیادہ ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے استاد پروفیسر ندیم احمد نے شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک روزہ قومی سمینار سے کیا۔ اپنے کلیدی خطاب میں پروفیسر ندیم احمد نے مزید کہا کہ نظیر، انجمن پنجاب، حلقۂ ارباب ذوق اور ترقی پسندوں نے جدید نظم کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اقبال نے بھی صنف نظم کی آبیاری کی اور طویل نظمیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ نظم میں طوالت کینوس کے اعتبار سے ہوتی ہے، اشعار کی تعداد کے اعتبار سے نہیں۔ پچھلی دہائی کے بعد مختصر اور متنوع موضوعات پر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ 'جدید اردو نظم: سمت و رفتار' کے عنوان سے منعقدہ اس سمینار کی صدارت امتیاز احمد کریمی کررہے تھے۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں نومنتخب اردو اساتذہ کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ آپ اپنے بچوں کو اردو نظم، غزل، شعر، نثر سب کچھ پڑھائیں، لیکن ان کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب آپ پڑھانے کا کام ذمہ داری سے ادا کریں گے۔ انھوں نے اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ بچوں کو مقابلہ جاتی امتحانوں کے لائق بنائیں، انھیں بڑے خواب دکھائیں اور ان کے اندر کامیابی کی للک پیدا کریں۔ اردو کسی زبان، کسی مضمون سے کم نہیں ہے۔ اس کے ذریعے بھی کامیابی کی اعلا منزلیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محسن رضا رضوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ میری نگاہ میں جدید نظم کی ابتدا نظیر اکبرآبادی سے ہوتی ہے، مگر انجمن پنجاب نے اسے ایک قطعی شکل عطا کی ہے۔ اقبال جدید نظم کا سب سے بڑا نام بن کر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے جدید نظم کو ایک واضح اور نمایاں شکل دی ہے۔

ڈاکٹر رضوی نے مزید کہا کہ بہار کے عبدالغفور شہباز نے نظیر کی بازیافت کی جس کی وجہ سے لوگوں نے نظیر کو جدید نظم نگار شاعر مانا۔ معروف فکشن نگار، ڈراما نگار اور شاعر ڈاکٹر قاسم خورشید نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ جدید نظم کی ابتدا کہیں سے کریں، میری نگاہ میں جدید نظم وہ ہے جس میں ہم عصریت ہو، جس میں انسان اپنے حالات اور جذبات کا ادراک کرسکے۔ اقبال اگر آج بھی ریلیوینٹ ہیں تو وہ جدید شاعر ہیں، نظیر اگر آج بھی زندہ ہیں تو وہ جدید ہیں۔ جدید وہ ہے جو ہمیں نیاپن اور جدت سے آشنا کرے۔ انھوں نے مزید کہا کہ عصری منظر نامے کے تحت لکھا گیا ادب جدید ادب کہلائے گا۔ ان خطابات سے قبل ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مہمانوں کا تعارف واستقبال کرایا اور موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے گذشتہ پچاس برسوں میں جدید نظم کے ارتقا پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے نعمان شوق، جمال اویسی، جینت پرمار، شبنم عشائی وغیرہ کی نسل کے متعدد نظم گوشعرا کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ جدید نظم موضوعات واسالیب کے تنوع اور جدت کے باوجود ہم عصر تنقیدی مباحث میں مرکزی مقام کیوں نہیں حاصل کرپارہی ہے؟ آخر میں صدر شعبۂ ڈاکٹر سورج دیو سنگھ نے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار میں پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر جاوید حیات، ڈاکٹر سرور عالم ندوی، ڈاکٹر مسرت جہاں، ڈاکٹر افشاں بانو، ڈاکٹر ہاشم رضا، ڈاکٹر نعمان قیصر، ڈاکٹر نجم الحسن عارض، ڈاکٹر عبدالباسط حمیدی، ڈاکٹر عشرت صبوحی، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر محمود عالم، ڈاکٹر ابوالکلام ڈاکٹر رحمت یونس، ڈاکٹر جاوید اختر اور ڈاکٹر شبنم کے علاوہ کثیر تعداد میں عظیم آبادی کی اہم شخصیات اور طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

اردو اساتذہ تنظیم نالندہ کی میٹنگ میں کئی قرار دادیں پاس

بہار شریف (26 ستمبر)۔ 25 ستمبر 2024 کو اردو اساتذہ تنظیم نالندہ کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت تنویر ساکت (صدر تنظیم) اور نظامت محمد ساجد اقبال (نائب صدر) نے کی۔ اس میٹنگ میں جن عہدیداروں نے شرکت کی اُن میں ماسٹر اعجاز احمد، ماسٹر فیض احمد امیری، حافظ محمد راشد انور اور سیّد شاداب شامل ہیں۔ نشست میں جن امور پر گفتگو ہوئی اور جو قرار دادیں منظور کی گئیں، وہ درج ذیل ہیں:

(1) تنظیم کا جلد سے جلد رجسٹریشن کیا جائے اور اس کام کو ترجیحی بنیاد پر انجام دیا جائے۔

(2) اردو اسکولوں میں اردو مضمون کے علاوہ دیگر مضامین کی تعلیم بھی مادری زبان یعنی اردو میں دی جائے، اس کو یقینی بنانے کے لیے تنظیم کے عہدیداران وارا کین مختلف اردو اسکولوں کا دورہ کریں گے۔

(3) جن اردو اسکولوں میں اسکول کے نام کا سائن بورڈ اردو میں نہیں ہے اُن کے بارے میں جانکاری حاصل کرکے اسکول کے سائن بورڈ کو اردو میں بنوانے کو یقینی بنایا جائے۔

(4) اردو طلبہ وطالبات کا ایک کوئز پروگرام جلد منعقد ہو اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ وطالبات کو انعام واکرام سے نوازا جائے۔

(5) اس کے علاوہ اردو زبان اور اردو اساتذہ سے متعلق دیگر مسائل پر بھی تبادلۂ خیال کیا گیا۔

آخر میں تنظیم کے عہدیداروں نے تمام اردو اسکولوں کے ذمے داران اور اردو اساتذہ سے گزارش کی کہ وہ کم از کم درجہ پانچ تک کے بچوں کو مادری زبان یعنی اردو میں ہی تعلیم دینے کی ہر حال میں کوشش کریں۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

عالم نقوی

لکھنؤ۔ اردو کے مشہور وممتاز صحافی عالم نقوی کا 3 اکتوبر 2024 کی شب دہلی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 72 برس تھی۔ وہ طویل عرصے سے علیل تھے۔ دہلی میں واقع لوک نائک اسپتال میں انھوں نے آخری سانسیں لیں۔ 4 اکتوبر کو امام باڑہ غفران مآب لکھنؤ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

عالم نقوی 10 اکتوبر 1952 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے اور لکھنؤ ہی کے سینٹ زیویرس اور شیعہ کالج میں انھوں نے تعلیم حاصل کی اور پھر اعلا تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی چلے گئے جہاں سے انھوں نے گریجویشن کیا اور پھر نفسیات کے موضوع پر انھوں نے گولڈ میڈل کے ساتھ ماسٹر ڈگری بھی حاصل کی۔

عالم نقوی عرصۂ دراز سے صحافت سے وابستہ تھے۔ انھوں نے روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 'قومی آواز' دہلی، 'اردو ٹائمز' ممبئی اور 'اودھ نامہ' لکھنؤ جیسے اہم اخبارات میں خدمات انجام دیں۔ انھوں نے صحافتی اصولوں کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور اپنے قلم کو تمام تر بندشوں سے ہمیشہ آزاد رکھا۔

نظر نقشبندی

ممبرا۔ ممبرا کے بزرگ شاعر اکبر علی شیخ المعروف بہ نظر نقشبندی 6 اکتوبر 2024 کی شام یہاں انتقال کرگئے۔ یہ اطلاع ہمیں جناب ندیم صدیقی نے دی ہے۔

نظر نقشبندی کا وطن مغربی یوپی کا مردم خیز شہر بریلی تھا مگر اُن کی پیدائش 22 جنوری 1951 کو گھاٹ کوپر (ممبئی) میں ہوئی۔ وہ ایک مدت کویت میں برسر کار رہے۔

مرحوم نظر نقشبندی شروع میں نظر بریلوی کے نام سے معروف ہوئے اور پھر نظر کے ساتھ 'نقشبندی' کا لاحقہ آخر دم تک لگائے رہے۔ اُنھوں نے نظر بریلوی کے نام سے افسانے بھی لکھے۔ ممبرا میں اُن کے کئی شاگرد بھی لیلائے شعر وسخن کی زلفیں سنوار رہے ہیں، جن میں تابش رام پوری کا نام نمایاں ہے۔ نظر نقشبندی گزشتہ ایک مدت سے صاحب فراش تھے، جب سے اُن پر فالج کا اثر ہوا تو وہ گھر ہی میں قید ہوکر رہ گئے تھے۔ چند ماہ قبل ممبرا کی ایک ادبی تنظیم نے اُن کا اعزاز واکرام بھی کیا تھا۔

امرت نگر میں واقع ممبرا کے قدیم قبرستان کی مسجد میں اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔ نظر نقشبندی مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔

اشعر رام نگری

وارانسی۔ اردو کے معروف شاعر وصحافی تاج الدین اشعر رام نگری کا طویل علالت کے بعد 96 برس کی عمر میں 10 اکتوبر 2024 کی شب میں گولا گھاٹ، رام نگر میں واقع رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی پورے پوروانچل میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی تدفین 11 اکتوبر کو بعد نماز جمعہ اُن کے آبائی قبرستان گولا گھاٹ، رام نگر، بنارس میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر بنارس کے تمام مکتبۂ فکر سے وابستہ اصحاب کے علاوہ بڑی تعداد میں شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔

اشعر رام نگری بنیادی طور پر صحافی تھے اور انھوں نے عمر کا بڑا حصہ صحافت کے پیشے سے وابستہ رہ کر گزارا۔ وہ مشرقی اتر پردیش کے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ 'قومی مورچہ' بنارس کے مدیر بھی رہے۔ گذشتہ برس ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں اتر پردیش اردو اکادمی نے ایک لاکھ روپے پر مشتمل انعام سے سرفراز کیا تھا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **عارف عزیز: مشاہیر ومعاصرین کی نظر میں**
مرتب : نعمت اللہ خاں ندوی
ضخامت : 446 صفحات
قیمت : 400 روپے
ناشر : نعمت اللہ ندوی، گلی نمبر 14 مکان نمبر 600، عارف نگر، بھوپال، 462001
تبصرہ نگار : رضوان فاروقی
موبائل: 7000815183

اردو کے معروف ادیب وصحافی عارف عزیز کے نام اور کام کا تعارف کرانے کی ضرورت اِس لیے نہیں کہ اخبارات ورسائل میں اُن کے تنقیدی وتحقیقی، سماجی وسیاسی موضوعات پر مضامین مسلسل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ عارف عزیز کی 41 کتابیں شائع اور دو کتابیں اُن کی شخصیت وقلمی خدمات پر مرتب ہوئی ہیں، جن میں سے 'عارف عزیز: مشاہیر ومعاصرین کی نظر میں' نئی کتاب ہے جو نعمت اللہ خاں ندوی نے مرتب کی ہے۔

446 صفحات کی اس ضخیم کتاب کا مقدمہ پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن نے تحریر کیا ہے۔ دوسرا تعارفی مضمون پروفیسر اختر الواسع کا اور تیسرا پروفیسر خالد محمود کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔

کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اپنے عنوان 'عارف عزیز: مشاہیر ومعاصرین کی نظر میں' کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے کیوں کہ اِس میں حکیم سیّد ظل الرحمٰن، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر حامد حسین، نعیم کوثر، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر مختار شمیم، ابراہیم یوسف، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، پروفیسر حنیف نقوی، اختر سعید خاں، کوثر صدیقی، عُمیر الصدیق ندوی، پروفیسر محمد نعمان خاں، پروفیسر شہزاد انجم، سہیل انجم، ڈاکٹر اخلاق اثر جیسے مشاہیر کے ساتھ، اشفاق مشہدی ندوی، خالد عابدی معصوم مرادآبادی، سراج نقوی، ڈاکٹر مہتاب عالم، ڈاکٹر محمد اعظم، ڈاکٹر رضیہ حامد، رضوان احمد ندوی، رشید انجم، پروفیسر عمر حیات غوری، ڈاکٹر خلیل الدین، شجاع الدین تماندار (مکہ مکرمہ) اور ڈاکٹر عمیر منظر جیسے ممتاز معاصرین نے عارف عزیز کی شخصیت وقلمی خدمات کے منفرد پہلوؤں پر 75 مضامین اور 13 آرا کے ذریعے روشنی ڈال کر کتاب کے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

کتاب کے مرتب نے اِسے گیارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے، جن کے مطالعے سے قارئین پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن کے الفاظ میں: 'عارف عزیز کے مطالعے کی وسعت اور فکر کے تنوّع کا اندازہ لگا سکتے ہیں'۔

صحافت پچاس سال سے عارف عزیز صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ 44 سال سے وہ کالم نویسی کر رہے ہیں جو روزنامہ 'آفتاب جدید' بھوپال سے شروع ہو کر 34 سال سے روزنامہ 'ندیم' بھوپال سے بھی شائع اور دوسرے اخبارات میں نقل ہو رہا ہے، اور اردو اخبارات کا قدیم ترین کالم شمار ہوتا ہے۔ وہ 13 سال سے روزنامہ 'اخبارِ مشرق'، دہلی و کلکتہ کا ضمنی اداریہ بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کے خاکوں کے چار مجموعے ایم پی اردو اکادمی شائع کر چکی ہے، ریڈیو اور سمیناروں کے لیے انھوں نے جو تنقیدی مضامین لکھے، سفرنامے قلم بند کیے، اخبارات کے لیے سیاسی وسماجی کالم رقم کیے، اُن کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اِن جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کی ترتیب، تدوین، کمپوزنگ اور پرنٹنگ معیاری ہے۔ قیمت 400 روپے ہے جسے نعمت اللہ خاں ندوی (موبائل نمبر 9893167882) سے رابطہ کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔

◆◆◆

نام کتاب : **میڈیا اور مسلمان**
(صحافی وادیب سہیل انجم کے مضامین کا انتخاب)
مرتب : ولی احمد خان
ضخامت : 308 صفحات
قیمت : 300 روپے
ناشر : رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں (مہاراشٹر)
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر
E-mail: ibraheem.siwal@gmail.ocm

اُردو کے بے لوث خادم ولی احمد خان کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ پیشے سے انجینئر اور ماوا انجینئرنگ ورکس احمد آباد (گجرات) کے ڈائرکٹر ہیں۔ وہ ہندستان کی مختلف ریاستوں میں اُردو کی فلاح و بہبود، اشاعت وترویج کے لیے تگ ودو کرتے رہتے ہیں۔ اسکولوں و کالجوں میں اُردو کی کتابوں کی فراہمی واساتذہ کی حوصلہ افزائی کرنا ان کا شغل ہے۔ شعرا وادبا کی کتابوں کی اشاعت اور ترویج کے لیے وہ ہر دم مستعد رہتے ہیں۔ ولی احمد خان کی اب تک کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مشہور اُردو صحافی سہیل انجم کے مختلف مضامین و کالمز کا انتخاب کر کے اسے 'میڈیا اور مسلمان' عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ مجھے مسلمانوں اور میڈیا کے موضوع پر ان کے مضامین اچھے لگے، اس لیے میں نے ان کو مرتب کر دیا ہے (ص 25)۔ زیرِ تبصرہ کتاب کا عنوان انگریزی کے مشہور صحافی ونود مہتا کے طویل مضمون 'میڈیا اور مسلمان' سے مستعار لیا گیا ہے۔ انگریزی مضمون کا اُردو میں ترجمہ سہیل انجم نے ہی کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'میڈیا اور مسلمان' کو ولی احمد خان نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے 'ماہ وسال اور مسلمان' میں مسلمانوں کے مسائل پر لکھے گئے 39 مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان اہم مضامین میں مسلم مسائل اور ملّی تنظیمیں، طلاقِ ثلاثہ اور پارلیمنٹ میں بحث، مسلم لڑکیوں کو ہندو بنانے کی مہم، گھر بچانے کے لیے ٹوپی کا سہارا، حالی اور مسلمانوں کی زبوں حالی، مولانا آزاد کا قولِ فیصل اور ہم مسلمان، شادیوں میں اسراف اور ہمارا رویہ، افطار پارٹیوں کا موسمِ بہار، دس منٹ میں تراویح: حافظ ریل بھی فیل، ہاشم پورہ فیصلہ انصاف سے کم انصاف، روہنگیا مسلمانوں پر ستم بالائے ستم، سری لنکا میں بھی مسلم بودھ تصادم، فلسطینیوں پر مظالم کی نئی داستان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے 'میڈیا کا چہرہ واقعات کے آئینے میں' میں 14 مضامین کو شامل کیا ہے۔ ان میں مسلمانوں کے میڈیا ہاؤس کیوں نہیں؟، میڈیا بائیکاٹ کی اپیل اور حقیقتِ حال، میڈیا مناظرین کی ضرورت، پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے، گوری لنکیش کے حوالے سے، شجاعت کی شجاعت کو سلام، ہم وہ نہیں جو ڈر کر کہہ دیں، میڈیا، سوشل میڈیا، اینٹی سوشل میڈیا، جب میڈیا کو سانپ سونگھ گیا، ہندستانی اور امریکی میڈیا میں فرق، میڈیا کی منفی رپورٹنگ، میڈیا کا زوال کیوں ہوا؟ اور 2018 کی فریاد اور میڈیا اہمیت کے حامل مضامین ہیں۔

سہیل انجم کے سینے میں مسلم مسائل کا درد پنہاں ہے۔ وہ بے باکی کے ساتھ اپنی بات قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ سماجی مسائل پر لکھا گیا ان کا مضمون 'شادیوں میں اسراف اور ہمارا رویہ' اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں موصوف نے شادی، جہیز اور شادیوں میں کھانوں کی بربادی پر ملت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ جب کسی بھی مسلم گھرانے میں شادی بیاہ کی رسم ادا کی جاتی ہے تو اس میں پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ اپنی شان وشوکت کا رعب لوگوں پر جمانے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ شادی میں شامل ہونے والے مہمانوں کی تعداد سے زیادہ کھانا بنوایا جاتا ہے۔ شادی ختم ہونے کے بعد یہ کھانا سڑکوں اور کوڑے دانوں کی زینت بنتا ہے۔ سہیل انجم لکھتے ہیں کہ اگر اپنے ہی محلے کے غربا میں یہ کھانا تقسیم کر دیا جائے تو کتنا بہتر ہو۔

سہیل انجم اس بات پر بھی خفا ہیں کہ مسلمانوں کے پاس ہر طرح کے وسائل ہونے کے باوجود وہ اپنا میڈیا ہاؤس کیوں نہیں بناتے؟ جب کہ مختلف ٹی وی چینلوں اور پرنٹ میڈیا میں باصلاحیت مسلم صحافی کام کر رہے ہیں۔ دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ کسی مسئلے پر جب بھی ٹی وی پر بحث ومباحثہ کا انعقاد کیا جاتا ہے تو اس میں نام نہاد مسلم رہنماؤں کو بلایا جاتا ہے اور ٹی وی شوز کے اینکر ان مسلم رہنماؤں سے بے سر پیر کے سوال کرتے ہیں جن کا ان کے پاس جواب نہیں ہوتا۔

دورِ حاضر میں مذہب کی تبدیلی ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ سہیل انجم نے اپنے مضمون 'تبدیلی مذہب کے واقعات اور مسلمان' میں ان مسائل کو اٹھایا جن سے پوری مسلم قوم نبرد آزما ہے۔ اس حساس مسئلے پر انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں۔ کیوں کہ بعض وقت یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر مسلم لوگوں نے اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر ہندو مذہب ترک کر کے اسلام کا دامن تھاما ہے۔ اپنا مطلب نکالنے کے بعد پھر سے یہ لوگ اپنے اصل مذہب میں چلے جاتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اخلاق واطوار سے لوگوں کے سامنے اسلام پیش کریں۔

ہندستان میں ایک بہت بڑا مسئلہ 'لو جہاد' کا بھی ہے۔ سہیل انجم نے اپنے مضمون میں بڑے ہی طمطراق کے ساتھ لکھا ہے کہ اکثریت کے لوگ بغیر کسی ثبوت کے مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہندو لڑکیوں کو مسلم نوجوان اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اس سے شادی کرتے ہیں، اس کے لیے باقاعدہ خلیجی ممالک سے فنڈنگ ہوتی ہے۔ جب کہ ان الزامات میں کوئی صداقت نہیں ہوتی۔

سہیل انجم نے اپنے مضمون 'دس منٹ میں تراویح، حافظ ریل بھی فیل' میں رمضان کے مقدس مہینے میں ادا کی جانے والی تراویح کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ انھوں نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار نپے تلے انداز میں کیا ہے۔ ان کی نظر میں ایسی عبادت کا کوئی فائدہ نہیں جس سے دل مطمئن نہ ہو۔ سوشل میڈیا پر انڈونیشیا کی وائرل ہوئی دس منٹ کی تراویح کلپس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہاں ہندستان میں کم از کم یالمون تالمون سمجھ میں آتا ہے اس میں صرف اللہ اکبر، الہ اکبر ہی سمجھ میں آتا ہے اور کچھ نہیں۔ بس دو سکنڈ میں رکوع وسجود مکمل ہو جاتے ہیں۔ برق رفتاری کے ساتھ اٹھک بیٹھک ہوتی ہے۔ کوئی معمر شخص نماز نہیں پڑھ سکتا، اس لیے خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت کی جائے تو بہتر ہے۔

میڈیا کے زوال پر سہیل انجم نے دوٹوک رائے کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے مضمون 'میڈیا کا زوال کیوں ہوا؟' میں میڈیا کے زوال کے اسباب پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پرنٹ میڈیا ہو کہ الیکٹرانک میڈیا، انھوں نے اپنے ضمیر کو حکومت کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ حکومت جیسا کہتی ہے انھیں ویسا ہی کرنا ہوتا ہے۔ موصوف کی نظر میں اب خبروں کی تلاش کے بجائے مباحثوں پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ اور یہ مباحثے سنجیدہ نہیں بلکہ ایک خاص ایجنڈے پر ہوتے ہیں۔ سوشل میڈیا کے زمانے میں خبروں کی نشر واشاعت برق رفتاری سے ہو رہی ہے۔ میڈیا کے زوال کے سبب کچھ مشہور صحافیوں نے اپنے اپنے یوٹیوب چینل بنا لیے ہیں، جس سے میڈیا کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا ملا ہے۔ اسی مضمون میں سہیل انجم نے یہ انکشاف کیا کہ پریس کلب آف انڈیا کی ساٹھ سالہ تاریخ میں پہلی بار اُردو پریس کے مسائل کو شامل کیا

گیا۔ موجودہ وقت میں اس کے ممبران کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔ مجموعی ممبران کے تقریباً دس فی صد مسلم صحافی ہیں جن میں اُردو صحافیوں کی بھی خاصی تعداد ہے (ص 298)

ولی احمد خان نے زیرِ تبصرہ کتاب پر مربوط و مبسوط مقدمہ رقم کیا ہے۔ اس مقدمے میں انھوں نے سہیل انجم کی صحافتی خدمات اور ان کے کالمز و مضامین پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ولی احمد خان نے اپنے مقدمے میں انگریزی، ہندی اور اُردو صحافت کا موازنہ بھی کیا ہے۔ ساتھ ہی ملک میں اُردو صحافت کی صورتِ حال کو بھی قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ولی احمد خان نے اپنے مقدمے میں اطہر فاروقی کی کتاب 'مسلم اینڈ میڈیا: امیجز، نیوز ورسز میڈیا' کے حوالے جگہ جگہ پیش کیے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے سہیل انجم کے ادبی و صحافتی سفر، تعلیم اور ملازمت وغیرہ کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا ہے۔ اس موقع پر میں ولی احمد خان کی توجہ ایک شعر کی جانب دلانا چاہتا ہوں جسے انھوں نے صفحہ 7 پر علامہ اقبال سے منسوب کیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

دراصل یہ شعر ظفر علی خاں کا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ اڈیشن میں اسے درست کرلیا جائے گا۔ سرورق پر پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے علاوہ مسلم نوجوانوں کی تصاویر نے قاری کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ کتاب کی پشت پر سہیل انجم اور ولی احمد خاں کا مختصر لیکن جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ولی احمد خاں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سہیل انجم کے بہترین کالمز و مضامین کا انتخاب قارئین کی نذر کیا۔

◆◆◆

بقیہ: محمود سروش: اپنے علم سے بے نیاز ایک عالم، ایک شاعر

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

اس زمانے میں اِس اسکول کے آس پاس کوئی ریسٹورنٹ یا ہوٹل وغیرہ نہیں تھا، کیپٹل سنیما یا پھر اب جہاں نیاج ہاؤس ہے، وہاں (انجمن سے) قدرے فاصلے پر ایک ہوٹل تھا (اب بھی ہے) اس ہوٹل میں جا کر چائے پی گئی ہم چائے پی کر جلدی سے بِل کی ادائیگی کے لیے ہوٹل کے کاؤنٹر کی طرف بڑھے تو پیچھے سے اُتنی ہی سرعت کے ساتھ سروش صاحب آئے اور کہنے لگے:

'ندیم میاں! کیا اِتنے بڑے ہوگئے ہو؟'

ہم ان کے اِس جملے پر خجل ہو کر رہ گئے...!

اس واقعے کو کوئی چار دہے تو ہوگئے ہوں گے!! اور یقیناً آج ہماری عمر بڑھ گئی ہے، ہم 73 برس کے بوڑھے تو ہوگئے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم 'بڑے' نہیں ہوسکے۔!!

محمود سروش محض شاعر نہیں تھے، انھوں نے تاریخ جیسے مضمون میں ممبئی یونی ورسٹی سے اور ناگپور یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کرلیا اور جب شعور کو پہنچے تو شاعری کا شوق ہوا اُس وقت علامہ آرزو لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا سو، جواں سال محمود سروش نے آرزو کی شاگردی اختیار کی۔ روایت ہے کہ آرزو اس نوجوان کو ہر دوسرے تیسرے دِن کوئی ایک مصرع دیتے اور اس مصرعۂ طرح پر کم از کم بیس سے پچیس شعر کہنے کی تاکید کرتے اور شرط یہ بھی ہوتی کہ جب میرے پاس آنا تو ہر شعر میں کم از کم ایک غلطی ضرور تلاش کر لینا اور کوشش یہ بھی کرنا کہ اس غلطی کی اصلاح بھی خود کرسکو اور جب کوشش کے باوجود اصلاح نہ کرسکو تو پھر مجھ سے کہنا اور اگر کسی شعر میں کوئی غلطی نہ ملے تو سمجھ لینا کہ مَیں اس میں کم از کم دو غلطی تو ضرور نکالوں گا۔ یہ سلسلہ چلا اور کئی برس تک چلا۔ محمود سروش مشق کی اس اگنی سے نکلے تو کندن بن چکے تھے پھر خود ان کے شاگردوں کا ایک حلقہ بنا۔ علامہ آرزو کا ایک جملہ ادبی تاریخ میں درج ہے:

'مَیں شاگرد نہیں، اُستاد بناتا ہوں'...اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بات حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ دہلی کے ایک سفر میں ہم ایک شام جامع مسجد کے اردو بازار سے گزر رہے تھے کہ فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کے ایک اسٹال پر نظر پڑی، چھٹی حِس نے کتاب اٹھانے کی ترغیب دی، سیاہ جلد کھولی تو چھٹی حِس پر نفس نے سَر اٹھایا، ہم نے اسے زیر کر کے کتاب کے اوراق پلٹنے شروع کیے تو پتا چلا کہ یہ تو کرناٹک (کنڑ) کے ادیب شیورام کارنت کا ناول ہے، جسے محمود سروش نے اردو کا جامہ دیا ہے، یہ کتاب نیشنل بک ٹرسٹ (دہلی) کے زیرِ اہتمام 1974 میں شائع ہوئی تھی، اُس وقت کتاب کی قیمت آٹھ روپے تھی، پھر وہ آٹھ سے 48 روپے ہوگئی، کتاب فروش نے تاڑ لیا کہ یہ کتاب اس کی دل چسپی کی ہے اس سے جب ہم نے سوال کیا کہ 'کیا قیمت دے دوں؟'

اس نے منہ پھاڑ کر دوسَو روپے کہا، مختصر یہ کہ ڈیڑھ سَو روپے میں ہم نے 'موت کے بعد' نامی یہ کتاب خرید لی، اس واقعے کو بھی دس برس سے زیادہ مدت ہوگئی، اس کتاب کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ محمود سروش ترجمے کے فن پر کس قدر قادر تھے۔

ہم نے آج پھر 'موت کے بعد' کی ورق گردانی کی تو احساس ہوا کہ ہماری موت کے بعد اس کتاب کا کیا ہوگا؟!

باطن میں ایک آواز گونجی 'میاں! اللہ نے دیمک کو بھی پیدا کیا ہے اور اسے بھی تو خوراک چاہیے۔!'

یہ سب سوچتے، سمجھتے ہوئے بھی ہم کتاب لکھ اور چھاپ رہے ہیں ہر چند کہ پڑھنے کا جیسا ذوق کل تک تھا وہ اب ہم میں بھی نہیں رہا، دوسروں کی نہیں اپنی اس محرومی پر رونے کو جی چاہتا ہے مگر ساقی فاروقی کے بقول:

رونا تھا بہت لیکن اشکوں کے لیے ترسے
آج اپنی محبت بھی نادار نظر آئی!

ندیم صدیقی
Building No:24,Flat no:101,
Sailesh Nagar, Nera Rly Station,
MUMBRA-400612, Dist Thane (MS)
Mob: 9323786610
E-mail: nadeemd57@gmail.com

اُردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر
رؤف پاریکھ
قیمت: 300 روپے

غروبِ شہر کا وقت
اُسامہ صدیق
قیمت: 900 روپے

چند فکری و تاریخی عنوانات
پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن
قیمت: 400 روپے

رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟
ڈاکٹر شمس بدایونی
قیمت: 300 روپے

کچھ اُداس نظمیں
ہربنس لکھیا
قیمت: 300 روپے

کلّیاتِ خطباتِ شبلی
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
قیمت: 400 روپے

ریت سمادھی
(گیتانجلی شری)
ترجمہ: آفتاب احمد
قیمت: 900 روپے

میانِ من و تو
(تحقیقی و تنقیدی مضامین)
پروفیسر شاہد کمال
قیمت: 500 روپے

بچوں کا گلدستہ
(پانچ جلدیں)
غلام حیدر
قیمت: 2400 روپے

فسادات کے پس منظر میں

سعادت حسن منٹو کے افسانے انسان دوستی کی مثال

مرضیہ عارف

سعادت حسن منٹو (1912 تا 1955) اردو کے افسانہ نگاروں میں اہم نام ہے، جو اپنے ہم عصروں سے زیادہ پڑھا گیا۔ منٹو کی تحریروں پر خوب بحث ومباحثہ ہوا، جتنی تعریف کی گئی، اس سے زیادہ تنقید ہوئی اور مقدمات بھی چلے۔ منٹو کے عہد کے لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر جیسے بڑے ادیب شامل تھے۔ مذکورہ ادیبوں کو ترقی پسندوں کی سرپرستی حاصل تھی لیکن منٹو کے قلم کی یہ طاقت ہے کہ 'ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں آئیں' کے مصداق اپنے عہد اور موت کے بعد بھی ان کا چراغ جلتا رہا۔ منٹو کے دور میں بیش تر افسانہ نگار آسمانِ ادب پر وقتی چمک دمک دکھا کر ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح خلا میں گم ہو گئے، اس کے برعکس منٹو پر لعن طعن کرنے والوں، انھیں جنس زدہ قرار دینے والوں اور فحاشی کا ملزم گردانئے والوں کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو نے اپنے عصر کے حالات ومسائل سے خود کو جوڑے رکھا اور اپنے عہد کے انسان کے جذبات واحساسات کی عکّاسی کی، نتیجتاً وقت کے ساتھ منٹو کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا، ان کی تحریروں کے مجموعوں کی اشاعت سے بھی اِس کا اندازہ ہوتا ہے جو اردو سے زیادہ ہندی میں شائع ہوئے اور پڑھے گئے یہاں تک کہ پبلشروں نے منافع کمانے کی نیت سے ان کے نام بھی بدل ڈالے۔

منٹو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ریاکاری سے انھوں نے پرہیز کیا، جو دیکھا یا سوچا جرأت کے ساتھ اسے بیان کر دیا۔ جہاں تک جنس کا تعلق ہے تو یہ منٹو کے فن کا ایک پہلو ہے، اسے ہم حقیقت نگاری بھی کہہ سکتے ہیں۔ فرد کے اندر کی کیفیات کو پیش کرنے میں منٹو کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ سماج کے گرے پڑے طبقے کو انھوں نے اپنا موضوع بنایا، خاص طور پر طوائفوں کی زندگی پر بے باکانہ قلم چلا کر ان کی مظلومیت کو واضح کیا۔ سماج کے ٹھیکے داروں نے منٹو کے کرداروں پر ناک بھنویں چڑھائیں، لیکن وہ کسی کو خاطر میں نہیں لائے۔ ایسے ہی ایک موقعے پر منٹو نے کہا تھا کہ 'افسانے میں نہیں لکھتا، میرے کردار لکھواتے ہیں'۔ منٹو کے کرداروں کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ عورتوں کی نفسیات، ان کی داخلی زندگی، جنسی مسائل اور سماجی استحصال کو نہایت باریکی سے انھوں نے پیش کیا ہے۔ 'ہتک'، 'کالی شلوار'، 'شاردا'، 'بو'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'موذیل'، 'ممی'، 'جانکی'، 'بابو گوپی ناتھ'، 'سرکنڈے کے پیچھے'، 'پیرن'، 'دھواں'، 'کھول دو' اور 'خوشیا' جیسے افسانوں سے اپنی نوعیت کے منفرد نسوانی کردار ابھر کر سامنے آتے ہیں، جس میں پختہ عمر کی عورتوں اور طوائفوں کی تعداد زیادہ ہے، لیکن کم سن لڑکیوں کی نفسیاتی زندگی کو بھی انھوں نے اچھوتا نہیں چھوڑا۔ 'دھواں' کی کلثوم اور بملا دو ایسی ہی نوخیز لڑکیاں ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں جو پهلو حاوی نظر آتا هے، وه انسانی زندگی اور اس کا نفسیاتی مطالعه هے۔ غیر معمولی حالات میں انسان سے کیا حرکتیں سرزد هوتی هیں اور اس میں کیا تبدیلیاں پیدا هوتی هیں، منٹو نے اپنے افسانوں میں اس کا گهرائی سے تجزیه کیا هے۔ فسادات کے پس منظر میں انهیں جهاں موقع ملا وه انسانیت اور اس کی روشن قدروں کو ابهارنے کی کوشش کرتے هیں۔ منٹو کی نظر میں انسانیت کسی خاص فرقه، مذهب یا گروه کی جاگیر نهیں۔

ہندستان کی تقسیم نے ایک ملک کو نہیں، اردو افسانے کو بھی تقسیم کر دیا۔ دونوں علاقوں کے سیاسی نظریے، ذہنی فضا، وطن پرستی، قومیت اور تہذیب کو نئے رنگ ومعنی پہنا دیے گئے۔ اس المیے سے متاثر ہو کر کئی اچھوتے افسانے لکھے گئے لیکن جنھوں نے زیادہ لکھا اور خاص تاثر چھوڑا، ان میں منٹو کا نام سرِ فہرست ہے، بالخصوص 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'بابو گوپی ناتھ'، 'ننگی آوازیں'، 'ٹھنڈا گوشت' اور 'کھول دو' تقسیمِ ملک سے پیدا شدہ مسائل سے تعلق رکھنے والے افسانے ہیں۔ 'کھول دو' اِن افسانوں میں سب سے موثر کہانی ہے۔ لفظوں کی تراش وخراش، بیان کی ندرت اور جامعیت نے اس کہانی کو سہلِ ممتنع کی مثال بنا دیا ہے۔ 'کھول دو' میں سکینہ کی خاموش چیخیں فساد کے ہر منظر میں آج بھی سنائی دیتی ہیں اور یہ احساس دلاتی ہیں کہ فسادات میں سب سے زیادہ ظلم کا شکار عورتیں بنتی ہیں۔

'ٹوبہ ٹیک سنگھ' تقسیمِ ملک کے موضوع پر منٹو کا گہرا طنز ہے۔ اس کا مرکزی کردار بشن سنگھ پاگل خانہ میں رہنے کے باوجود اپنی سرزمین کو نہیں بھولتا۔ اس کردار کے ذریعے منٹو نے اس دور کی فرقہ وارانہ سیاست پر تیکھے وار کیے ہیں اور ایک پاگل کی وطن سے محبت کو ہوشمندوں کے لیے سوالیہ نشان بنا دیا ہے، جو گائے اور بھینسوں کی طرح انسانوں کے تبادلے پر راضی ہو گئے۔ منٹو نے فرقہ وارانہ فسادات اور کشمیر کی جنگ پر جو افسانے تحریر کیے، ان میں ایک قدرِ مشترک انسان دوستی اور انسانی قدروں کی فراوانی ہے۔ انسان اور اس کی فطرت کی نیرنگیاں منٹو کے افسانوں میں رچی بسی ہیں۔ سیاسی تحریکات اور فسادات کے پس منظر میں منٹو نے جو لکھا، اس میں بھی انسانی شخصیت کے اسی پہلو کو ابھارا گیا ہے۔ یہ افسانے محض اخباری رپوٹیں نہیں، زندگی اور انسان کی نفسیات کا مطالعہ ہیں، یہاں تک کہ لڑائی جھگڑوں میں بھی، جہاں عموماً انسان درندہ بن جاتا ہے، منٹو نے انسان دوستی کے اس رُخ کو فراموش نہیں ہونے دیا۔

منٹو پر الزام ہے کہ فسادات کے بیان میں وہ جنسی تلذّذ حاصل کرتے ہیں، اس کی نفی ان کے افسانے 'کھول دو'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'رام کھلاون' اور 'موذیل' کے کرداروں سے ہوتی ہے، جو حیوان بن کر انسانیت کے جامے میں رہتے ہیں۔ خصوصیت سے 'موذیل' کی یہودن کے کردار کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تمام تر بدچلنی کے باوجود وہ ایک دردمند دل کی مالک ہے اور سکھ لڑکی کی جان بچانے کی خاطر خود کو غنڈوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ فسادات پر منٹو کی مختصر کہانیاں 'سیاہ حاشیے' بھی بڑی جاندار ہیں۔ ان کہانیوں میں منٹو نے انسانوں کی انسانوں پر وحشت وبربریت پر ہی روشنی نہیں ڈالی، ان کی مظلومیت پر بھی نوحہ خوانی کی ہے۔

بحیثیتِ مجموعی منٹو کے افسانوں میں جو پہلو حاوی نظر آتا ہے، وہ انسانی زندگی اور اس کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ غیر معمولی حالات میں انسان سے کیا حرکتیں سرزد ہوتی ہیں اور اس میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، منٹو نے اپنے افسانوں میں اس کا گہرائی سے تجزیہ کیا ہے۔ فسادات کے پس منظر میں انھیں جہاں موقع ملا وہ انسانیت اور اس کی روشن قدروں کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ منٹو کی نظر میں انسانیت کسی خاص فرقہ، مذہب یا گروہ کی جاگیر نہیں۔ اپنی کہانی 'سہائے' کے مرکزی کردار کی زبان میں وہ یہی بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مرضیہ عارف
مکان نمبر 4، اسٹریٹ نمبر 1، ریت گھاٹ روڈ، بھوپال–462001
Mob. 6267843376

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی–٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی–110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***